Date of Publication: 09-04-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 April, 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۱۵ تا ۲۱ راپریل ۲۰۱۴ء | 15-21 April 2014
شمارہ نمبر: ۱۵، جلد نمبر: ۷۳ | Issue: 15, Vol.:73

نسل پرستی اور دیگر حیوانی خصوصیات

لیلا نائیڈو کی انگریزی خودنوشت
Leela Naidu: A Patchwork Life
کے ایک باب سے

پہلی قسط

لیلا نائیڈو

انگریزی سے ترجمہ: **مظفر حسین سیّد**
(11/29- سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)

نسل پرست بھیڑیے

وہ ایک بریلی سہ پہر تھی۔ سوئٹزر لینڈ میں بسنے کے روز ہمارے اسکول ری اکوے لیونا لے پیک موتے کی بھی کچھ جلدی ہو جاتی تھی۔ لیڈا میں برف باری کا لطف اُٹھاتے ہوئے جنیوا کی سڑکوں پر گشت کرنے لگی۔ برف تازہ تازہ تھی۔ ایک دم سفید، دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح۔ میری عمر اس وقت کوئی سات برس رہی ہوگی۔ میری ناک ہوا کو سونگھ رہی تھی اور برف تھی کہ گرے جا رہی تھی۔ اس سے قبل میرے والد مجھے کو آلپس میں ایک گلیشیر دکھانے لے گئے تھے۔ ہم کوئی آٹھ گھنٹے پیدل چل کر پونٹریسنا نامی مقام تک گئے اور آئے تھے، لیکن وہاں برف زمین پر بچھی تھی، سیال سی، جس کا اپنا کوئی راپ نہیں تھا۔ یہاں آسمان سے براہ راست ہوتی برف باری کا نظارہ میرے لیے نیا تھا۔ راستے کی جانی پہچانی تیز خوشبوؤں سے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اپنے گھر واپسی کے راستے پر ہی گامزن تھی۔ بیکری سے آتی ہوئی تازہ بریڈ کی خوشبو، جس میں ایک مخصوص آمیزش تھی اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایک گوشے سے تازہ تازہ پھولوں کی بھینی بھینی بو آ رہی تھی اور تیسری سمت نانبائیوں کی دوکان تھی، جس سے چاکلیٹوں کی سر کو چکرا دینے والی مدہوش کر دینے والی مہک آ رہی تھی اور چوتھی جانب کرانے کی دوکان سے بڑی میٹھی میٹھی خوشبوئیں آ کر میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ دوکان دار میرا دوست بھی تھا۔

تبھی پشت کی جانب سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی: ''بھاگو کالی لڑکی بھاگو۔''

میں بہ مشکل سمجھ پائی کہ وہ میرے ہی اسکول کی ایک سینئر طالب کی آواز تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور خوف سے لرز گئی۔ میری آنکھیں تیز روشنیوں کی چمک سے کہانیوں والے خرگوش کی طرح خیرہ ہو گئیں۔ تبھی مجھے تین برہم افراد نے غراتے ہوئے گھیر لیا۔ وہ زور زور سے چلا رہے تھے ''دیکھو دیکھو یہ سُرخ مچھلی''۔ ''کیا میں سُرخ مچھلی جیسی لگ رہی تھی؟'' میں نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

''ہمیں اس مچھلی کو جان سے مار دینا چاہیے۔'' ان میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔ پھر آواز آئی: ''مارو''۔

میرے سر پر کیوں کا ایک تھیلا بم بن کر گرا اور میں زمیں بوس ہو گئی۔

''تمہارے جسم پر کتنے رنگ ہیں؟'' ان میں سے ایک نے چیخ کر پوچھا۔

تبھی میرے اوپر کئی لاتیں پڑیں، کئی گھونسے پڑے اور آخر میں میں بے ہوش ہو گئی۔

بے ہوشی اور بے خبری بڑی رحم دل ہوتی ہے۔ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر میں تھی۔ میری ماں مجھ پر جھکی ہوئی تھیں اور ایک ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے اتنا تو محسوس کر لیا کہ وہ دونوں ہی تشویش کا شکار لگ رہے تھے۔ تبھی میری یادداشت واپس آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اب انھیں تشویش میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں کیوں کہ میں بہ خیریت گھر واپس آ چکی تھی اور اب میں محفوظ تھی۔

نسل پرستی سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔ کئی دن تک میں اس الجھن میں رہی کہ آخر میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا، جو وہ مجھ سے اس قدر برہم تھے کہ مجھ پر حملہ آور ہو گئے اور میں اُن کی غنڈہ گردی اور بدمعاشی کا شکار ہو گئی۔ اس سلسلے میں میں نے ماسن سے بھی استفسار کیا اور انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر ان کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا (میں ماں کو ماسن کہتی تھی)۔

میں نے اپنے ماضی کا جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہوا کہ شاید اس واقعے کو میں نے پہلے بھی وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمارے اسکول میں ہر ہفتے، جلسے جلوس کے لیے استعمال ہونے والے ایک بڑے کمرے میں سبھی طلبہ جمع ہوتے تھے اور پھر ہم میں سے کسی ایک کو گفتگو کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ ہماری اُستانی خود چھوٹی سی کسی گڑیا کی طرح تھیں، جو اپنے سُرخی مائل بالوں کو تنکوں کی بنی ایک ٹوپی میں چھپاتی تھیں اور اس میں ڈیلیا کا ایک پھول بھی آویزاں کرتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ہندستانی پھولوں کے بارے میں گفتگو کروں... اور پھر اگلے ہفتے انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ہاتھی کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہاتھی کو صرف ہندستان سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ پھر ہندستان کے رنگا رنگ تہوار تھے۔ غالباً وہ ہندستان سے خاصی متاثر تھیں اور شاید اسی لحاظ سے مجھے بھی پسند کرتی تھیں یا پھر ایسا ہو کہ کوئی اور طالب علم بولنا ہی نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ اس سے اگلے ہفتے پھر لیلا کا نمبر تھا اور اس مرتبہ اُسے انواع و اقسام کے ہندستانی کھانوں کے بارے میں اظہار خیال کرنا تھا۔

''تمہارے کھانوں میں اتنی تیز مہک کیوں ہوتی ہے؟'' کسی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے ہندستان کے مخصوص مصالحوں کے بارے میں وضاحت کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے باوصف میں جانتی تھی میری فی البدیہہ تقریر کے دوران حاضرین کا ایک خاص طبقہ اپنے ننگی چہرے لیے منہ بنا بیٹھا تھا۔

پھر کئی برس بلکہ برسوں بعد لندن میں میری ملاقات اپنے ہی دیو پیکر بھوت سے ہوئی۔ دراصل معروف زمانہ مکابی، ہیرو جی کیوتا، اُن دنوں لندن آئے ہوئے تھے۔ وہ ان کم عمر چھوکروں کے گروہوں کی تصویریں اُتارنا چاہتے تھے، جو ان دنوں لندن کے معمر اور بزرگ لوگوں کو دہشت زدہ کرنے پر آمادہ تھے۔ اس موضوع پر نیویارک ٹائمز کے سنڈے میگزین کے لیے وہم (سیریس) ایک تجربہ کہانی تیار کر رہا تھا اور کیوتا اس کی فلم بندی پر مامور تھے۔ آخر کار ہم تین ایسے لڑکوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، جن میں سے دو کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا۔ وہ سب حیرت ناک حد تک کم سن تھے۔ دونوں بھائی آٹھ اور دس برس کے درمیان تھے، جب کہ ان کا ساتھی گیارہ برس کا تھا۔ بڑی کاوش کے بعد آخر بارش سے جھکی ایک سہ پہر کو وہ ہمیں اپنی انوکھی تکنیک کا تماشہ دکھانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

''سب سے پہلے ہم اُن کی ٹانگ کھینچ کر انھیں لڑکھڑا دیتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اپنے بوٹوں پر رکھ لیتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے بتایا۔

اس کے بعد میں نے ان کے جوتوں کو دیکھا۔ وہ ٹھیک ویسے ہی تھے، جیسا کہ میں توقع کر رہی تھی۔

''ہم ان خستہ حال لوگوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔'' پہلے والے لڑکے کے بھائی نے کہا اور اپنی جیب سے ایک کنگھا نکالا، جس کے دندانے بیچ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے کنگھے کو اپنے منہ کے ایک گوشے میں دبایا اور بولا: ''ہم انھیں اس طرح زخمی کرتے ہیں، پھر وہ سوروں کی طرح چیختے ہیں۔''

پھر اس نے ایک کچا آلو دکھایا، جس میں ایک بلیڈ لگا ہوا تھا۔ "یا پھر ہم انھیں اس طرح سے مجروح کرتے ہیں۔" اس نے مزید کہا۔

جب بیرونی نے اپنا کام مکمل کرلیا تو ہم نے ان لڑکوں کو کچھ مٹھائیاں دیں۔

"ہمیں مٹھائی نہیں چاہیے۔" ان کے قائد نے کہا: "لیکن آپ چاہیں تو ہمیں بیئر پلا سکتی ہیں۔"

اس کے بعد ہم ان کی والدہ سے بھی ملے لیکن ہم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ انھیں اپنے بچوں کی حرکتوں کے سلسلے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ شاید جنیوا میں نوجوان حملہ آوروں کے والدین کو بھی اس قسم کی کوئی فکر لاحق نہیں رہی ہوگی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کے والد مفقود الخبر تھے اور والدہ شراب کی دھنی تھیں۔ وہ چھوٹے موٹے کام کرتی اور چھوڑتی رہتی تھیں اور ان کے بچے کسی بھی قسم کے خوابوں سے محروم، امید و بیم کے درمیان بڑے ہو رہے تھے۔ دراصل جب کسی بھی قسم کا تصور واضح نہ ہو تو ایسے ہی ثمرات برآمد ہوتے ہیں۔ میری نظر میں تشدد بھی تخیل کے فقدان سے ہی جنم لیتا ہے۔ اگر آپ یہ باور کرسکیں کہ جیسا سلوک آپ دوسروں کے ساتھ کر رہے ہیں، ٹھیک ویسا ہی سلوک آپ کے ساتھ بھی روا رکھا جائے گا تو آپ کسی کے خلاف تشدد پر آمادہ نہیں ہوسکتے۔ جنیوا کے ان نوجوانوں میں بھی پرواز تخیل کا فقدان تھا۔ انھیں صرف افتراق نظر آرہا تھا، اس لیے، انھوں نے حیوانوں کی طرح مجھ پر حملہ کردیا کیوں کہ بادی النظر میں، میں اُن سے مختلف تھی۔ نیز ہم دونوں میں جو کچھ مشترک تھا وہ انھیں نظر نہیں آیا۔

صحت یاب ہونے کے بعد میں اسکول جانا چاہتی تھی۔ تاہم میرے والد کا خیال تھا کہ میرے لیے کسی پبلک اسکول میں داخل ہونا زیادہ بہتر ہوگا، جہاں میں عامیوں اور بورژواؤں دونوں کے ساتھ میل ملاپ کا رویہ رکھ سکتی تھی۔

اسکول کے ارباب انتظام اس بات سے خاصے دہشت زدہ تھے کہ ان کی ایک طالبہ پر حملہ ہوا تھا۔ انھوں نے میری ماں کو یقین دلایا کہ قصور واروں کے خلاف تیزی کے ساتھ کارروائی ہوگی۔ تاہم ان کا خیال بھی یہی تھا کہ میں کسی ایسے اسکول میں زیادہ محفوظ رہ سکتی تھی، جہاں کے لوگ نسبتاً کم تنگ نظر ہوں۔ کوئی ایسا اسکول جس کا دائرہ اپنے ہمہ رنگ طلبہ و طالبات کی موجودگی کے سبب زیادہ وسیع اور وقیع ہو۔

دراصل میرے والدین پہلے سے ہی اس نہج پر سوچ رہے تھے۔ اس حملے کے بعد ان کی سوچ کو نئے پر لگ گئے تھے۔ پھر یہ طے پایا کہ میں ماں کے ساتھ جنیوا میں رہوں گی اور پاپا ہفتہ، اتوار یا جب بھی ممکن ہوگا ہم سے ملنے آتے رہیں گے۔ آخر کار میں 'لا ایکول روز بالڈ' نام کے ایک اسکول میں داخل ہوگئی۔ یہ ایک پرائیویٹ اسکول تھا جس میں متمول کیتھولک عیسائیوں کی بچیاں پڑھتی تھیں۔ اس اسکول کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ وہاں تہذیب کی بہتر نگرانی ہوگی اور دوسری نسلوں کے لوگوں کے ساتھ کچھ زیادہ ادب و لحاظ کا مظاہرہ کیا جائے گا۔

خیر، نئے اسکول میں کسی نے مجھ پر حملہ تو نہیں کیا لیکن ایک طالب علم اسے پیر سے کھلے عام ہندومت اور ہندوستان کا تمسخر اڑاتا تھا اور ذلیل کرتا تھا۔ یعنی کہ اب ان لوگوں کے پاس لیلا نائیڈو کے خلاف کھیل کھیلنے کا خوب موقع تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے جم میں گھیر لیا۔ چند دولت مند اور ہم رنگ کیتھولک لڑکیاں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں اور ہنسنے لگیں، ہنستی رہیں۔ انھوں نے اپنے پسینے بھرے کسرتی جوتے سیدھے میری ناک سے لگادیے اور پوچھنے لگیں: "تم اس کی پوجا کرتی ہو نا؟"

اسے بیرے کو اندازہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے الفاظ سے کس طرح بھوت پریتوں کو آزاد کردیا تھا۔ میرے خیال میں اگر اسے پتا ہوتا تو شاید وہ خود بے حد دہشت زدہ ہوجاتا۔ لیکن میں نے اسے بتایا نہیں اور خود وہ جانتا نہیں تھا۔ بہر کیف حالات اور زیادہ خراب ہوتے، اس سے پہلے ہی میں نے وہ اسکول چھوڑ دیا۔ اس بار میرا داخلہ جنیوا کے مشہور اسکول 'ایکو انٹرنیشنل' میں ہوا۔

آئندہ پانچ برس کے دوران میں نئے اسکول کے انگریزی اور فرانسیسی شعبوں میں باری باری تعلیم حاصل کی اور مجھے وہاں خوب لطف آیا۔ وہاں طالب علم بھی ملے جلے تھے، مختلف نسلوں اور رنگوں کے۔ اسی اسکول میں احمد قاچاؤ بھی تھا۔ ایک مہاسوں بھرے منہ والا نوجوان، جس کے بال گھنگھرالے تھے۔ وہ جنونانہ طور پر تمام تر حدیں پھلانگ کر مجھ سے محبت کرنے لگا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں رہ رہا تھا۔ اس کی ماں ایران کی جلاوطن قاچاؤ کی ملکہ تھیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی ٹرام سے اسکول آتے جاتے تھے۔ ہر دن وہ مجھے انتظار کرتا ملتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں، جن میں ایک غم ناک فریفتگی دیوانگی بسی تھی۔

ایک دن احمد نے مجھ سے کہا کہ اس نے میرے لیے ایک نظم لکھی ہے۔ میں خاصی متاثر ہوئی حتیٰ کہ میں نے وہ نظم پڑھی، جس کے الفاظ کچھ یوں تھے:

"میری کے پاس ایک میمنہ تھا..."

"یہ میں نے تمھارے لیے لکھی ہے۔" اس نے کہا۔

بھلا ایسی بلیغ، اشاروں والی نظم کے بارے میں تبصرہ کرنے والی میں کون ہوتی تھی۔

پھر اس کی والدہ نے میری ماں کو ایک انتہائی گزارشانہ خط لکھا، جس کا ما فی الضمیر یہ تھا کہ احمد نے ان سے یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر اس کی شادی لیلا کے ساتھ ہوجائے تو وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی تعلیم مکمل کرسکے گا۔ اس خط کو پڑھ کر میری ماں بُری طرح چونک گئی تھیں۔ اس وقت میری عمر بہ مشکل چودہ برس تھی اور احمد بھی عمر میں مجھ سے بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ حالاں کہ اسکول میں میری پشت پر صرف اس کا ہیولی ہی رہ گیا تھا، کیوں کہ اسے امتحان سے روک دیا گیا تھا۔

میری والدہ نے اس بات پر زور دیا کہ میں جاکر احمد کی ماں سے مل لوں۔ ایک تارک وطن شہنشاہیت کے تمام تر طمطراق و اسباب محل کے درمیان، جس میں ایرانی قالین، چاندی کے قدیم برتن اور شاندار پردے شامل تھے، شہزادی محترمہ تشریف فرما تھیں۔ انھوں نے مجھ سے میرا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگا۔ میں نے ان کی جہاں دیدہ آنکھوں میں دیکھا اور یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ آیا وہ واقعی سنجیدہ تھیں۔ وہ مجھے سنجیدہ ہی لگیں۔

"شہزادی عالیہ" میں نے بڑے سنبھل کر کہا: "میں اس کے ساتھ شادی نہیں کرسکتی، تاہم میں پڑھائی میں اس کی مدد ضرور کروں گی۔"

میں نے سوچا کہ ہم باہر درختوں کے سائے میں تھوڑی سیر کریں، تاکہ میں یہ سمجھ سکوں کہ احمد اپنی اسکولی پڑھائی میں اتنی خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے؟ میں نے تجویز تو رکھ دی، پھر خیال آیا کہ شاید مجھے یہ پیش کش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ کوئی معقول بات نہیں تھی کہ ایک عشق زدہ نوجوان کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں وقت گزارا جائے۔ لیکن احمد نے بڑی شرافت اور شائستگی بھرا رویہ اپنایا اور وہ مجھے کئی بھیانک قصے سناتا رہا کہ کس طرح اس کے والد نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال خطرناک حد تک کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے والد کا ایک محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ قیدیوں کے سر قلم کراکے یہ مشاہدہ کرتے تھے کہ ان کے سروں سے محروم دھڑ کتنی دیر تک کھڑے رہ سکتے تھے اور حرکت کرسکتے تھے۔ شاید اس طرح وہ مجھے متنبہ کررہا تھا کہ اس کی تجویز کو مسترد کرنے کے نتائج کتنے خطرناک ہوسکتے تھے۔

آخرش میں نے اس سے پوچھا کہ تعلیم کو لے کر اس کی پریشانی کیا تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ غبی اور کند ذہن نہیں تھا۔

"دراصل مجھے پڑھنے وڑھنے میں دل چسپی نہیں ہے۔" اس نے صاف

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام 'ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کے دوسرے دن یعنی ۸ مارچ ۲۰۱۴ کو جو پوری دنیا میں یوم عالمی خواتین کے طور پر بھی منایا جاتا ہے، اس مناسبت سے اس دن کے دوسرے سیشن کو خواتین کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر چمن تیواری نے فرمائی جب کہ ورجینیا یونیورسٹی، امریکہ کی ڈاکٹر گیتا پٹیل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر محترمہ ثانیہ اقبال ہاشمی، جناب اینڈریو امسٹز اور شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایسوی ایٹ پروفیسر، ڈاکٹر باراں فاروقی نے اپنے مقالے پیش کیے۔



تصویر میں (دائیں سے بائیں) محترمہ ثانیہ اقبال ہاشمی، پروفیسر چمن تیواری، ڈاکٹر گیتا پٹیل، امریکہ کے جناب اینڈریو امسٹز اور شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایسوی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر باراں فاروقی خطاب کرتے ہوئے۔

یادِ رفتگاں

پروفیسر محمد شفیع کی غزل گوئی

پروفیسر قیصر جمال
شعبۂ اردو، فارسی
سیوا سدن کالج، برہانپور
(مدھیہ پردیش)

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری کی ابتدا ہی سعدی دکنی، برہانپوری کی غزل سے ہوتی ہے اور ایک طویل عرصے تک اقلیم سخن پر حکومت کرنے کے بعد آج غزل اردو شاعری کی مقبول اور ہر دل عزیز صنف سخن ہے۔ اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ اس کے آہنگ میں پائی جانے والی وہ لوچ اور لچک ہے جو اپنی بنیادی ہیئت تبدیل کیے بغیر ہر عہد سے ہم آہنگ ہو جانے اور نہایت پر اثر اور خوش اسلوبی سے اس کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا یہی وصف اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اردو غزل کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ ہر دور میں زندگی کے دوش بہ دوش چلتی رہی اور اس نے ناسازگار حالات میں بھی اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہی وہ صنف سخن ہے جس نے فنکاروں کو اپنی آغوش میں پناہ دے کر شہرت و عزت بخشی۔ غزل کا تعلق عشق و محبت کی داستان اور واردات قلبی سے نہایت گہرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری پر ہمیشہ غزل کی حکمرانی رہی ہے۔ غزل کی زبان ہمیشہ علامتی زبان رہی ہے۔ اس میں کوئی بات براہ راست یا صاف صاف نہیں کہی جاتی بلکہ اشاروں، کنایوں، علامتوں اور تمثیلوں کے پیرایوں میں ڈھکے چھپے انداز میں کہی جاتی ہے۔ یہ رموز و علائم اپنے لغوی، صوتی یا لفظی معنی میں نہیں بلکہ اپنی خصوصی اصطلاحی یا مرادی معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ ان رموز و علائم کے پیچھے افکار و تصورات کی ایک پوری کائنات آبادی ہوتی ہے اور پس منظر میں پورا معنوی اور تصوراتی نظام آباد ہوتا ہے۔

اردو ادب میں جن شعرا نے غزل کے روایتی اسلوب اور ایمائیت کے تنگ و محدود دائرے میں رہتے ہوئے اپنے اعلا و ارفع خیالات و افکار اور پاکیزہ جذبات سے اردو غزل کو مالا مال کیا اور اسے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا ان میں پروفیسر محمد شفیع کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

پروفیسر محمد شفیع ۱۹؍جون ۱۹۵۰ء کو شمالی بندیل کھنڈ کے مردم خیز ضلع مہوبہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مہوبہ اور جھانسی میں حاصل کی، بعد میں ساگر یونیورسٹی سے گریجویشن کیا، پھر بندیل کھنڈ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ ۱۹۸۹ء میں 'آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ' عنوان کے تحت ساگر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۰ء میں ان کا برہان پور (مدھیہ پردیش) کے سیوا سدن کالج میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر تقرر ہوا اور ۳۰؍مارچ ۲۰۰۹ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔

ڈاکٹر شفیع کو غزل سے فطری لگاؤ تھا کیوں کہ ان کے والد بناؤ محمد مہوبوی اور دادا حبیب محمد بھگت بندیل کھنڈ کے مشہور و معروف شعرا میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن ان کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات کے شوق نے اس جذبے کو دبا دیا تھا۔ تاہم ہنگامی حالات میں کوئی ضرورت پیش آجاتی یا کوئی خاص واقعہ تاثر پیدا کر دیتا تو ان کی شاعرانہ فطرت رنگ لائے بغیر نہ رہتی۔ اس عالم میں وہ جو بھی کہتے اس میں ایک انوکھی شان پیدا ہو جاتی تھی۔

انھوں نے شاعری کے میدان میں حمد، نعت، سلام، منقبت، دوہے، نظم اور غزلیں وغیرہ کہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے ہی شاعر کہلانے کے مستحق رہے۔ ان کی غزل میں جہاں روایتی غزل کے علامتی نظام کا محور حسن و عشق اور اس سے متعلق جذبات ہیں جن میں غم کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے، وہیں انفرادی جذبات و خیالات کے بجائے اجتماعی مسائل کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں میں انفعالیت، جنس زدگی اور یکسانیت کا عنصر موجود ہے وہیں فعالیت، جوش عمل اور تازگی کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ انھوں نے غزل کے منفی رجحانات کو بدل کر مثبت رویہ اپنایا نیز غزل میں ہمت، حوصلہ اور رجائیت کے عناصر شامل کیے، اسی لیے ان کی غزلوں میں لہجے کی نرمی، شگفتگی اور متانت کے بجائے بلند آہنگی اور نکھار پائی جاتی ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں عشقیہ رنگ و آہنگ کے ساتھ لطیف و خوب صورت جذبات بھی رکھتی ہیں جو ان کی کلاسکی غزل کی خاص شناخت ہے۔ اس میں وہ موثر آفاقی عنصر موجود ہے جس میں ہر شخص کی دل بستگی کا سامان بہم کیا گیا ہے۔ ان کے عشقیہ رنگ و آہنگ میں بھی عشق کے ماورائی، مبہم و غیر حقیقی تصورات کے بجائے حقیقت اور ارضیاتی سچائی موجود ہے۔ ان کے یہاں عشق اور معشوق کا تصور روایتی عشق و معشوق کے تصور سے مختلف ہے۔ ان کا عشق پوری طرح ارضیاتی حقائق کا حامل ہے، جیسے

مجھے دیوار پہ تصویر کی ہو کوئی
انجمن میں تری بیٹھے رہے ہم رات گئے

جب تم نہیں رہو گے تو کس کام کی حیات
تم ہو تو کائنات کی زینت ہے زندگی

الگ الگ رہے تو یہ سفر بھی کٹتی دور تھا
چلے جو ساتھ ساتھ تو کٹتی بہت وہ رات کی

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر محمد شفیع نے کلاسکی روایات کی قدیم اور پائیدار بنیادوں پر اپنی جدید طرز سخن کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں شاعر اور قاری کے درمیان ترسیل کا مسئلہ حائل نہیں ہوتا وہ اپنی بات موثر اور دل پذیر انداز میں کہنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے جو بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے غزل کے میدان میں خوب مشق بہم پہنچائی ہے جس کا اظہار ان کے لہجے کی سلاست اور ان کے بیان کی صفائی سے بہ خوبی ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں ان کے شب و روز کے تضادات، واقعات و سانحات کا آئینہ ہے۔ انھوں نے جیسا سوچا جیسا چاہا ویسا ہی اپنی غزلوں کو الفاظ دیا ہے۔ وہ شاعری کا حلقہ ہی نہیں رکھتے بلکہ ان کی زنبیل فکر میں زندگی کا ایک آفاقی تصور بھی موجود ہے جس میں صداقت، حسن اور خیر کے جذبے کی متوازن ہمکاری بھی ہے، اسی لیے انھوں نے اپنی غزلوں کو نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنایا کیوں کہ وہ شاعری کو نہ صرف انسانی جبلت کی تہذیب اور تزکیۂ نفس کا وسیلہ سمجھتے ہیں بلکہ انسانی معاشرے کی تربیت و تعمیر و تزئین کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ عمومی طور پر وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ساتھ ہی تخلیقی عمل کی پُراسراریت اور وجدانی محرکات کے اثرات بھی ان کے یہاں پائے جاتے ہیں، اسی لیے انھوں نے تنگنائے غزل کو کلاسکی بنیاد پر وسعت دے کر اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے قابل بھی بنایا جس میں انھوں نے زمینوں کے ساتھ اقدار کی کڑیاں بھی پیش کیں:

آئے تھے لوگ بھیس بدل کر نئے نئے
لیکن ہمارے چہرے پہ چہرہ نیا نہ تھا

جتنے تھے گل زمیں سے مری تشنگی پہ لوگ
لیکن کوئی اپنے کوئی کھوتا نہ تھا

جیسے کترن کاٹتے ہیں اس طرح کاٹا ہمیں
جس کے ہاتھوں میں زمانہ قینچیاں دے کر گیا

انھوں نے اپنی غزل کو زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اظہار کا ذریعہ بنا کر واقعیت کا آئینہ دار بنایا۔ اسی لیے وہ ذات و کائنات کے کرب کے مشترک تخلیق کار محسوس ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی غزل واضح طور پر ان کے احساس کا اظہار ہے اور شاعری احساس سے ہی محسوس کیے جانے کا نام ہے۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے ہی اپنی غزل کو معتبریت فراہم کرتے ہوئے فکر و فن کرتے ہیں وہ ملی، قومی جذبات ہوں یا تکثیری تقاضوں کا احساس یا پھر عہد حاضر میں اقدار و روایات کی بے حرمتی کا غم، ان کی غزلوں میں کھل کر سامنے آ جاتے ہیں

ولولہ جن کے دلوں میں تھا خلا میں پہنچے
ہم سے پتھر بھی ہواؤں میں اچھالا نہ گیا

تجربہ ایک ہوا ہے یہ فسادات کے بعد
کیسے جاتی ہے کوئی رات کسی رات کے بعد

اوڑھی سی ایک لہر سونامی کہیں جسے
پل بھر میں ڈھیر کر دیا سائنس کا بھرم

ہر طرف جنگ ہے دہشت ہے ریاکاری ہے
ہے یہی گردش ایام تمھیں کیا معلوم

ہر طرف گھر ہے یہاں کانچ کی دیواروں کے
کوئی پتھر نہ اچھل جائے وہ تدبیر کرو

یہ ترقی بھی کیا ترقی ہے
آدمیت کو شرم آتی ہے

یہ دنیا آپ کو پرواز کا جو دے گی
مگر اڑان سے پہلے ہی پر کتر دے گی

ترقی کا یہ کیسا دور آیا
ہے نفرت آدمی کو آدمی سے

غزل کے ان اشعار سے پروفیسر محمد شفیع کے افکار و خیالات کے ساتھ ان کی غزلوں کی سمتوں، کیفیتوں اور سطحوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک سچائی ہے کہ وہ کلاسکی روش پر اعتماد کے ساتھ چلنے والے شاعر تھے لیکن زبان کے روایتی اسالیب کے علاوہ نئے سیاق میں اس کے تخلیقی استعمال سے بھی خوب واقف رہے تھے۔

اردو دنیا

عربی وفارسی کو دوبارہ شامل کرنے پر یو پی ایس سی فیصلے کرے

ہائی کورٹ نے مفاد عامہ کی عرضی منظور کی

نئی دہلی (۲۶ مارچ)۔ یونین پبلک سروس کمیشن (یو پی ایس سی) کی لسانی فہرست میں سے عربی اور فارسی کو غیر ملکی زبان کہہ کر باہر نکالے جانے کے خلاف آج ہائی کورٹ نے بڑی راحت دیتے ہوئے نہ صرف (پی آئی ایل) مفاد عامہ کی عرضی کو منظور کر لیا بلکہ یو پی ایس سی کو ہدایت دی کہ وہ عرضی گزار کی ریپریزنٹیشن پر فیصلہ کرے۔ عدالت نے عرضی گزار کو بھی ہدایت کی کہ اگر یو پی ایس سی آپ کے خلاف فیصلہ کرتی ہے تو وہ دوبارہ پی آئی ایل داخل کر سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ میں آج اس معاملے کی سماعت کے دوران یو پی ایس سی کے وکیل نے عدالت سے کہا کہ یو پی ایس سی نے عربی اور فارسی کو ایک سال قبل ۵ مارچ ۲۰۱۳ء کو فہرست سے خارج کیا تھا، چوں کہ اس فیصلے کو اب ایک سال گزر چکا ہے، اس لیے پی آئی ایل کو خارج کر دیا جائے۔ دوسری جانب ایڈوکیٹ شاہد علی کے ہمراہ ایڈوکیٹ محمد شارق، انور خلیل اور وسیم احمد نے عدالت کو بتایا کہ یو پی ایس سی کے اس فیصلے کے خلاف مسلسل احتجاج جاری ہے، وہ اپنے حق کی لڑائی لڑنا نہیں جانتے اسی وجہ سے ایک سال کا وقت لگا۔ اگر قوم کے دیگر لوگ اس کے لیے آگے آتے تو پھر انھیں پی آئی ایل فائل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دونوں فریق کی دلائل سننے کے بعد جسٹس سحد اجوگ اور جسٹس ایم ایس وبا شرما نے ایڈوکیٹ شاہد علی سے پوچھا کہ آپ نے عدالت میں پی آئی ایل داخل کرنے سے قبل یو پی ایس سی کو ریپریزنٹیشن دی تھی؟ اس کے جواب میں شاہد علی نے کہا کہ ہم نے گزشتہ ۵ دسمبر ۲۰۱۳ء اور ۲۰ مارچ ۲۰۱۴ء کو یو پی ایس سی میں دو مرتبہ ریپریزنٹیشن دی تھی۔ عدالت نے اس حیرانی کے ساتھ پوچھا تو ابھی تک اس پر فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا۔ عدالت نے یو پی ایس سی کے سینئر ایڈوکیٹ کو ہدایت دی کہ وہ ریپریزنٹیشن پر فیصلہ کریں اور اس فیصلے سے عرضی گزار کو مطلع بھی کریں۔ عدالت نے عرضی گزار سے کہا کہ اگر یو پی ایس سی آپ کے خلاف فیصلہ لیتی ہے تو پھر آپ دوبارہ عدالت میں پی آئی ایل داخل کر سکتے ہیں۔ سماعت کے بعد ایڈوکیٹ شاہد علی نے تفصیل سے بتایا کہ عدالت کا فیصلہ یقیناً بہت اچھا ہے، اس فیصلے کی روشنی میں ہمیں آگے بڑی مدد ملے گی۔ اگر یو پی ایس سی نے ہمارے حق میں فیصلہ سنایا تو بہتر ورنہ ہم دوبارہ عدالت کا رخ کریں گے۔ (انقلاب۔ دہلی)

دی اسکولر پبلک اسکول اسلام پور میں اردو استاد کی تقرری

اسلام پور، مغربی بنگال (۳۰ مارچ)۔ اسلام پور ویلفیئر ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری جناب سوبیر بسواس جو اسلام پور شہر کے مشہور و معروف دی اسکولر انگلش میڈیم پبلک اسکول کے ذمہ داروں میں سے ایک ہیں، انھوں نے ایک ملاقات میں نمائندہ آبشار کو جانکاری دیتے ہوئے کہا کہ دی اسکولر پبلک اسکول میں اردو مادری زبان کے بچوں کے سرپرستوں کی طلب اور خواہش پر اسکول ہٰذا کے اردو بچوں کے لیے دوسری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس شروع ہو گئی ہے اور اس کے لیے اردو استاد کی باضابطہ بحالی بھی کر دی گئی ہے تاکہ جو بچے اردو مادری زبان سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اپنی مادری زبان کی تعلیم اسی انداز میں ملے جس انداز میں بنگلہ یا دیگر مادری زبان کے بچوں کو ملتی ہے۔ سوبیر بسواس نے اطراف کے اردو میڈیم سرپرستوں کو خوش خبری دیتے ہوئے مزید کہا کہ اسلام پور سب ڈویژن بنیادی طور پر اردو اکثریتی علاقہ رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ یہاں کے اردو داں طبقے نے بنگلہ کو بھی بڑے پیمانے پر گلے لگایا ہے۔ یہ ان کی روشن خیالی اور دیگر زبان سے محبت اور احترام کی دلیل ہے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں واضح طور پر کہا کہ کوئی یہ تسلیم کرے یا نہ کرے میں ہمیشہ اردو اور بے روزگار نوجوانوں کے روزگار کے لیے فکرمند رہا۔ دی اسکولر پبلک اسکول انگلش میڈیم اسکول ہے۔ یہاں جو اردو مادری زبان والے بچے انگریزی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کا رزلٹ (نتیجہ) یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ دیگر زبانوں کے بچوں سے کسی بھی لحاظ سے پیچھے نہیں ہیں۔ فی الوقت یہاں سے فارغ اردو مادری زبان والے بچے ملک کے اعلیٰ تعلیم گاہوں میں بہتر مظاہرہ کر رہے ہیں۔ (آبشار۔ کلکتہ)

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی 80 ویں سالگرہ پر

'انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب' کا اجرا



تصویر میں (دائیں سے بائیں): ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر سید رضا حیدر، جناب شاہد ماہلی، پروفیسر منیجر پانڈے، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، جناب شاہد مہدی، ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر اطہر فاروقی

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ۲۸ مارچ ۲۰۱۴ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے اعزاز میں ترتیب دی گئی کتاب "انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب" کا اجرا بہار و ہریانہ کے سابق گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی اور سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ جناب شاہد مہدی کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس کتاب کو ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر رضا حیدر اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے ترتیب دیا اور انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اردو کے ان ممتاز ادیبوں میں ہیں جن کا انیسویں صدی کی تاریخ، تہذیب، روایت اور ادب پر اہم علمی کام ہے۔ ماسٹر رام چندر پر لکھی ہوئی آپ کی کتاب ادبی دنیا میں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہی تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر کتاب کے مرتبین نے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کے اعزاز میں ایک ایسی کتاب ترتیب دی ہے جس میں 22 بزرگ ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین ۱۹ ویں صدی کی تاریخ، ادب اور تہذیب کا پوری طرح سے احاطہ کرتے ہیں۔ جلسے کی ابتدا میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کتاب کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ، جناب شاہد مہدی اور پروفیسر منیجر پانڈے نے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی ادبی خدمات پر گفتگو کی۔

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقع پر انجمن ترقی اردو (ہند)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اردو اکادمی، غالب اکادمی، عالمی اردو ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، مکتبہ جامعہ، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، شعبۂ اردو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی، شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ذاکر حسین کالج کے علاوہ دہلی کے دیگر علمی و ادبی اداروں کے سربراہوں کی طرف سے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا گیا۔ اس جلسے کی خاص بات یہ تھی کہ دہلی کے بھی اداروں کے نمائندے موجود تھے اور انھوں نے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کو اظہار تہنیت پیش کیا۔

اردو میڈیم اسکولوں کے قیام کا وعدہ حکومت یوپی پورا کرے

لکھنؤ (۳۰ مارچ)۔ کل ہند تنظیم تحفظ ناموس مدارس کے صدر مولانا نور الہدیٰ قاسمی بستوی کی قیادت میں ایک وفد نے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو سے ملاقات کی اور ریاست میں اردو میڈیم اسکولوں کے قیام سمیت دیگر امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ وفد کے سربراہ نے وزیر اعلیٰ سے کہا کہ سماج وادی پارٹی نے اپنے انتخابی منشور میں یوپی میں اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کا وعدہ دو سال قبل کیا تھا مگر اس بارے میں کوئی عملی قدم اب تک سامنے نہیں آیا ہے، حکومت کو اپنا وعدہ نبھانا چاہیے۔ وفد میں شامل اراکین نے 'انقلاب' کو بتایا کہ وزیر اعلیٰ نے اس بات پر مثبت یقین دلاتے ہوئے کہا کہ حکومت اس پر کام کر رہی ہے اور جلد ہی مثبت چیزیں دیکھنے کو ملیں گی، حکومت اپنا وعدہ پورا کرے گی۔ اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ مسلمانوں کے لیے تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے مقصد سے اقلیتی آبادی میں اسکولوں کی تعداد بڑھانے اور آئی ٹی آئی قائم کیے جانے پر بھی گفتگو ہوئی۔ وزیر اعلیٰ سے ان کی سرکاری رہائش گاہ ۵۔کالی داس مارگ پر ملاقات کرنے والے وفد میں مولانا نور الہدیٰ قاسمی کے علاوہ تنظیم کے ریاستی صدر مولانا مفتی معراج، مولانا رحمت اللہ نوری، مولانا محمد منعم، مولانا مفتی ریحان، مولانا سکندر، مولانا نور اللہ قاسمی، مولانا نعیم الدین، مولانا مفتی نعیم اختر، ادارۃ اللہ نور اور شفیق احمد خاں وغیرہ موجود تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

ووٹوں کی سیاست سے اردو کا سب سے زیادہ نقصان

نئی دہلی (۲۰ مارچ)۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے سہ لسانی فارمولے کو چہار لسانی فارمولے میں تبدیل کرے اور اس کے تحت کم سے کم دو سال تک اردو کو لازمی طور پر پڑھایا جائے۔ یہ مطالبہ آج چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے سابق چیئرمین اور 50 سے زیادہ کتابوں کے مصنف ڈاکٹر نریش نے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے خصوصی بات چیت کے دوران کیا۔

ڈاکٹر نریش نے کہا کہ اگر نیت ٹھیک ہو تو یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے لیکن یہ قدم اٹھانے کے لیے سیاسی خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ چہار لسانی فارمولہ نافذ کرکے اردو کو پرائمری یا مڈل سطح پر کم سے کم دو سال ضرور پڑھایا جانا چاہیے اور اس کے نمبر مارک شیٹ میں جوڑے جانے چاہئیں۔ اس کے تحت اردو کا ابتدائی نصاب ہونا چاہیے جس میں طلبہ کو کم سے کم حروف شناسی میں ماہر بنا کر لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اکادمیاں تو بہت قائم ہیں لیکن اس سے اردو کی ترویج و ترقی نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ کچھ سیمینار اور مشاعرے ہو جائیں اور ان لوگوں کو پیسے مل جائیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے جیسا کہ سیاسی پارٹیوں نے مشہور کر دیا ہے بلکہ آج بھی اس ملک کا غیر مسلم طبقہ اردو ہی بولتا ہے۔ پڑھتا یا لکھتا اس لیے نہیں ہے کیوں کہ اسے اردو پڑھائی ہی نہیں جا رہی۔ اس زبان کا خاصہ ہے کہ کوئی بھی اسے مار نہیں سکتا۔ اگر ایک بار کوئی اردو سیکھ لے اور حروف شناسی سے واقف ہو جائے تو پھر اسے کوئی اردو سے الگ نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر نریش نے کہا کہ ملک میں ووٹوں کی سیاست نے اردو کا سب سے زیادہ نقصان کیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اردو داں طبقے کو اپنا ایک سیاسی پریشر بنانا چاہیے تاکہ حکومت کو اس کے حق میں قدم اٹھانے پر مجبور کیا جا سکے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

آسنسول کارپوریشن میں اردو عملے کی بہت جلد بحالی ہوگی

آسنسول۔ موجودہ ترنمول کانگریس سرکار نے آسنسول میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت تو دے دی ہے مگر سرکار کی طرف سے صرف خوش کن اعلان کے بعد اب تک اس سرکاری احکام کو آسنسول میں عملی طور پر نافذ نہیں کیا گیا۔ اردو والے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ یہاں کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اردو کے سلسلے میں جو سرکاری اعلانات کیے گئے ہیں ان کا عملی طور پر مظاہرہ ہو۔ گزشتہ ایک برس کے انتظار کے بعد بالآخر آج انجمن ترقی اردو ہند کی آسنسول شاخ کے ایک وفد نے اپنے صدر حاجی عبدالجلیل کی قیادت میں آسنسول کارپوریشن کے میئر تاپس بنرجی سے ملاقات کی اور تحریری میمورنڈم کے ذریعے میئر سے اردو زبان جاننے والے افراد کی بحالی کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ کارپوریشن کے ذریعے نکلنے والے نوٹس یا اشتہارات اردو زبان میں بھی نوٹس بورڈ میں چسپاں کیے جائیں تاکہ اردو والوں کو بھی پتا چل سکے کہ ممتا بنرجی وزیر اعلا کے اس قدم کو کامیابی ملی ہے اور اردو کے ساتھ برسوں سے جو سوتیلا سلوک جاری تھا اب ختم ہو گیا۔ انجمن کے اس وفد نے میئر سے یہ بھی درخواست کی کہ کارپوریشن میں اگر کسی تقرری کے امتحانات ہوں تو ان امتحانوں کے لیے جہاں بنگلہ اور انگریزی میں سوال نامے آئیں وہیں اردو زبان میں بھی سوال نامے دیے جائیں۔ میئر تاپس بنرجی نے انجمن کے اس وفد کے ذریعے اردو زبان کے مسائل کو توجہ سے سنتے ہوئے وفد کو یقین دلایا کہ بہت جلد وہ اردو بولنے اور لکھنے والے کی تقرری کریں گے تاکہ اردو میں آنے والی درخواستوں کو پڑھا جا سکے۔ میئر تاپس بنرجی نے انجمن کو ہر طرح سے یقین دلایا کہ اردو زبان کے لیے سرکار نے جو اعلان کیا ہے اس اعلان کا نفاذ عملی طور پر اس کارپوریشن میں ہوگا۔ میئر کی اس یقین دہانی پر وفد نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اردو زبان کے تعلیمی مسائل کے سلسلے میں انجمن نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ ان مسائل کو لے کر انجمن بردوان کے ڈی ایم اور محکمے کے اعلا افسران سے جلد ملاقات کرے گی۔

(آبشار، کلکتہ)

کارپوریشن اسکولوں میں اردو میڈیم کو مستقل کیا جائے

نئی دہلی۔ سٹی زون کے سالانہ سائنس میلے کا افتتاح ایم سی ڈی پھول منڈی اسکول دریا گنج میں آل محمد اقبال کے ہاتھوں ہوا جس میں اسکولی بچوں کے ذریعے تیار سائنسی ماڈل نمائش میں لگائے گئے۔ اس کے علاوہ کارپوریشن اسکولوں میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے اساتذہ اور نمایاں نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ننھے بچوں کے ذریعے شاندار ثقافتی پروگرام اور حب الوطنی کے گیت گائے گئے۔ مہمان خصوصی آل محمد اقبال نے کہا کہ کارپوریشن اسکولوں میں تعلیم کا معیار بہتر ہوا ہے۔ سٹی زون کے 54 کارپوریشن اسکولوں میں بہتر سے بہتر سہولیات مہیا کرائی جانی چاہیے۔ آل محمد اقبال نے زیر تعلیم بچوں میں اردو اور انگلش کے بڑھتے رجحان پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کارپوریشن اسکولوں میں پڑھنے والے بچے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں سے کسی بھی طرح کمتر نہیں ہیں۔ انھوں نے ڈی سی سے کہا کہ کارپوریشن اسکولوں میں اردو میڈیم کو مستقل کیا جائے۔ اس موقعے پر ڈپٹی کمشنر سٹی زون راجیش کمار سمیت ایجوکیشن محکمے کے کئی افسران موجود تھے۔

(انقلاب، دہلی)

اک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار جناب علی امام نقوی کا ۱۱ مارچ ۲۰۱۳ء کو ممبئی میں انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ علی امام نقوی صاحب کا آبائی وطن اترپردیش کے ضلع میرٹھ کا قصبہ عبداللہ پور تھا۔ اُن کے والد نوجوانی میں ہی ممبئی چلے گئے تھے لہٰذا علی امام نقوی کی تعلیم ممبئی میں ہی ہوئی۔ علی امام نقوی نے ستر کی دہائی میں افسانہ نگاری شروع کی اور اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نے مکان کی دیمک' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ علی امام نقوی کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'مہابلی' ۱۹۸۸ء میں دہلی کے سیمانت پرکاشن سے شائع ہوا۔ علی امام نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں کئی بہترین کہانیاں اردو ادب کو دیں، جن میں اُن کی ایک کہانی 'بتیس دانتوں میں گھری زبان' اور ایک دوسری کہانی 'گدھ' کافی مقبول ہوئیں۔ ۱۹۹۱ء میں علی امام نقوی کا پہلا ناول 'تین بتی کے راما' منظر عام پر آیا۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'گھٹتے بڑھتے سائے' ۱۹۹۳ء میں تخلیق کار پبلشرز دہلی سے شائع ہوا اور اس کے بعد اُن کا چوتھا افسانوی مجموعہ 'موسم عذابوں کا' ۱۹۹۸ء میں اسی ادارے سے شائع ہوا۔ علی امام نقوی کا دوسرا ایک اہم ناول 'بساط' ۲۰۰۰ء میں اور پانچواں افسانوی مجموعہ 'کہی ان کہی' بھی تخلیق کار پبلشرز دہلی سے شائع ہوئے۔ ۷۰ اور ۸۰ کی دہائی میں نوجوان افسانہ نگاروں میں علی امام نقوی نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی تھی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر طاہر رزاقی ۲۳ مارچ ۲۰۱۳ء کو سنبھل میں انتقال کر گئے۔ وہ طویل عرصے سے برین ٹیومر کی وجہ سے زیر علاج تھے۔ وہ 58 برس کے تھے۔ مرحوم کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر طاہر رزاقی محلہ سرائے ترین واقع مدرسہ ضیاء العلوم میں مدرس تھے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے 'مجبر سنبھلی کی خدمات' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اور انھیں ماہر عروض تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی شعری و ادبی خدمات پر انھیں کئی انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر طاہر رزاقی کے انتقال پر متعدد علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر جناب صدیق مجیبی کا ۲ مارچ ۲۰۱۳ء کو رانچی کے اپولو اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ وہ 87 برس کے تھے۔ مرحوم غیر منقسم بہار میں بہار اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین بھی رہ چکے تھے۔ وہ مختلف امراض میں مبتلا تھے۔ صدیق مجیبی مرحوم اردو کی جدید شاعری میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی مجموعے بھی شائع کیے جو کافی مقبول ہوئے۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر کرنا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

علی سردار جعفری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے

علامہ اقبال ادبی مرکز کے زیر اہتمام سردار جعفری صد سالہ تقریب کا انعقاد

بھوپال (۱۸ مارچ)۔ ساہتیہ اکادمی کے علامہ اقبال ادبی مرکز کے زیر اہتمام علی سردار جعفری کی صد سالہ تقریب اور کل ہند مشاعرے کا انعقاد ٹرائبل میوزیم میں کیا گیا۔ پروگرام کی ابتدا میں اقبال مرکز کی ڈپٹی ڈائرکٹر نصرت مہدی نے سبھی مہمانوں کا پھولوں سے استقبال کیا اور اپنے استقبالیہ تقریر میں علی سردار جعفری کی لندن میں دی ہوئی تقریر کا کچھ حصہ پیش کیا۔ صدارت جناب اقبال مجید نے فرمائی۔ نظامت معروف مصنف اور شاعر رضا نقوی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جناب عالم نے علی سردار جعفری اور ترقی پسند تحریک پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں مہمان خصوصی پروفیسر شفیق اللہ (دہلی) نے علی سردار جعفری کی حیات، فن اور شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ سردار جعفری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ڈرامے، تنقید، نظمیں اور غزلیں لکھیں اور ہدایت کاری کے شعبے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ 'نیا ادب' اور 'گفتگو' جیسے رسائل کی ادارت کی۔ ان سب کے علاوہ علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ سردار جعفری بنیادی طور پر طویل نظم کے شاعر تھے۔ وہ 'نئی دنیا کو سلام' جیسی ڈرامائی نظم کے شاعر تھے اور تصویروں سے گفتگو کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ سردار کے یہاں بیک وقت مختلف خواص کا مشترک عمل نظر آتا ہے۔ یہ چیز دیکھنی ہو تو 'اودھ کی خاک حسیں' کے نام تحریر کی 'دیوار' ہی 'دنیا کو سلام' پڑھا جا سکتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : کھلتی کلیاں
مصنف : عارف نقوی
ضخامت : ۱۷۶ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

'کھلتی کلیاں' عارف نقوی کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے جس کے بارے میں خود شاعر فرماتے ہیں کہ: ''دراصل 'کھلتی کلیاں' میرے سندیسے ہیں۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے جو متاثر ہوتے اور کلبلاتے رہتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے پیش کر دوں''۔ اس سے قبل بھی موصوف کی کئی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی ہیں: شاعری (زخموں کے چراغ، خلش)، افسانے (تلاش سحر، ایک سے چار، پیاسی دھرتی جلتے ساگر)، سرگزشت (یادیں اور کچھ کہانیاں، نقوش آوارہ)، ڈرامے (نئی زندگی، سوانگ، سوداگر روپ، دور کے ڈھول، غلاموں کی ملکہ رضیہ سلطانہ، امپائر، کوئن، ساری) اور تاریخ (جرمنی کل اور آج، جرمنی اتحاد کے درپن میں)۔ اس کے علاوہ انھوں نے جرمن زبان میں بھی نظمیں (Dornen und Rosen) اور افسانے (Rikschafahrer) قلم بند کیے ہیں۔

عارف نقوی کی جنم بھومی لکھنؤ ہے، جس کی فضاؤں میں بقول عارف ''اشعار پھولوں کی طرح مہکتے ہیں''۔ لکھنؤ میں نہ صرف ان کے شاعر دوستوں کا ایک بڑا حلقہ تھا بلکہ انھیں مشاعروں میں معروف شاعروں کے روبرو اپنا کلام سنانے کے مواقع بھی فراہم ہوتے تھے۔ مجبوری روزگار، عارف نقوی کو وطن سے دور برلن (جرمنی) لے کر چلی گئی۔

غریب الوطنی نے جہاں ایک جانب عارف نقوی کو مغربی لٹریچر سے آشنا کر دیا وہیں دوسری جانب ان کو جذباتی کیفیت سے بھی دوچار کر دیا۔ ان کے یہاں انسانی ہمدردی (کھلی زیست، الفت)، فرقہ وارانہ ہم آہنگی (تکرار)، غریب پروری (ایک لڑکی)، حب الوطنی (وطن، مادر وطن)، حقیقت پسندی اور معروضیت ملتی ہے۔ ان کے فکر پر سوشلزم اور ترقی پسندی کی چھاپ مرتسم ہے مگر وہ نعرے بازی سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے (رات)۔ عارف نقوی جنگ و جدل کے خلاف ہیں اور امن و امان کے خواہاں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں دہشت ناک تباہی کے مناظر (سوال، خلش)، امریکی مظالم اور فلسطینی حریت پسندی (فلسطینی بچے کی فریاد) کی دلدوز نظمیں ملتی ہیں۔ ان کی سوچ میں رجائیت صاف طور سے جھلکتی ہے۔ (چمن چمن میں نقش)۔ نظم 'چڑیا' ادب اطفال میں ایک اہم اضافہ ہے جس میں چڑیا ڈر اور خوف کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ 'کھلی زیست' میں بھی 'اے باپ' استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ 'ننھی یاسمین' اور 'ایک بچی کا سوال' بھی اسی ضمن میں خوبصورت نظمیں ہیں۔ 'داغ' اور 'فنکار جدید' میں شاعر نے ادب کی گرتی ہوئی قدروں پر نشتر زنی کی ہے۔

عارف نقوی کی نظموں سے چند اقتباسات حاضر خدمت ہیں۔

آج شیطان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر
دھرم کے نام پہ وہ جرم کیا کرتے ہیں
نوع انساں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں
(دہشت پسند)

وطن کے نام پہ اوروں کی دنیا مٹا دینا
ستمگروں کے ستم حرف وفا کو مت بھلا دینا
وطن کے نام پہ دلوں میں عداوت مت لگا دینا
(وطن)

قسم خدا کی مجھے خود پہ شرم آتی ہے
کہ میرے دیس میں ایمان بک رہا ہے کوئی
بموں کی آگ سے دوزخ بنا رہا ہے کوئی
(عذاب)

غزلوں میں بھی عارف نقوی نے یہی اسلوب اپنایا ہے اور باطنی تجربات سے زیادہ سماجی حقیقت پسندی کو موضوع بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خودداری انساں سیکھو تو انساں کی عظمت پہچانو
خود اپنی ہستی میں تم گر ڈوب سکو تو کچھ بھی نہیں

انھیں بھی خواہش تجلی تھی مجھ کو شوق وصال
نظر ملا نہ سکے ہم تو کیا بیاں کرتے

اسی کو کہتے ہیں افلاس ذہن انسانی
جہاں کو درد نہ سمجھے بتوں سے پیار کیا

نشیمن کی تباہی کا سبب تھے جو گلستاں میں
وہ شعلے رقص کرتے ہیں شرارے مسکراتے ہیں

خدا کو تہذیب و تمدن کا خدا کہتا ہے
جس کو تہذیب و تمدن کو ملانا آیا

نفرت کا سندیسہ ہے مذہب کا بہانا ہے
ذہنوں میں جہالت ہے دہشت کا زمانہ ہے

شاعر عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ زبان کی اسی سلاست اور سادگی کے باعث ان کی شاعری دل کو چھو جاتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ عارف نقوی اچھے افسانہ نگار ہیں یا اچھے شاعر مگر اتنا واضح ہے کہ وہ جو کچھ بھی تحریر کرتے ہیں اس میں ان کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ بقول عارف:

تو نے ہوئے قلم سے ٹپکتا ہے خون دل
تحریر بولتی ہے زباں گر خموش ہے

مجھے امید ہے کہ اردو ادبی حلقوں میں اس شعری مجموعے کی خوب پذیرائی ہوگی۔

○○

نام کتاب : میر و غالب کے حریف
مصنف : سید مرتضیٰ حسین بلگرامی
ضخامت : ۲۱۳ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کو لکھنے اور پڑھنے سے خاص شغف ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ تحقیق، تلاش و جستجو کے بعد اپنے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس لیے ان کی ہر کاوش میں معنویت ہوتی ہے۔ وہ ہمہ جہت نثر نگار ہیں۔ ان کے کئی تحقیقی مضامین مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کو اہل نقد و نظر نے بہ نظر تحسین دیکھا ہے۔ ۱۹۵۸ء سے ایک کتاب کا مسودہ 'ادیبوں کے حالات ان کی اپنی تحریر میں' مختلف ادیبوں سے ان کی زندگی میں لکھوائے تھے جو محفوظ ہیں اور جو تقریباً دو ہزار صفحات پر محیط ہیں۔

'میر و غالب کے حریف' کتاب میں 33 مضامین، کچھ خطوط اور دیگر دانشوروں کی رائے الگ الگ مضمون کی شکل میں شامل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں پیش لفظ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا تحریر کردہ شامل ہے۔ 'اپنا آپ' عنوان کے تحت سید صاحب نے اپنی خود نوشت مختصراً تحریر کی ہے۔ میر اور غالب سے متعلق تین مضامین، سرسید سے متعلق 3 مضامین، صفیر بلگرامی سے تعلق رکھنے والے ۸ مضامین ہیں، ان کے علاوہ دو بھائی (بلقیس بخاری)، سلام آخر (مشفق خواجہ)، ملوک چند محروم وغیرہ شامل ہیں۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کی عمر ماشاء اللہ 88 برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ ان کا قلم رواں دواں ہے۔ ان کو اپنی بڑھتی عمر کا احساس ہے اور یہ بھی کہ تحریر میں کوئی سقم نہ رہ جائے، لکھتے ہیں:

''عمر کی جس منزل میں ہوں اس میں اتنے امور پر خامہ فرسائی کرنا آسان بات نہیں۔ حافظہ جس قدر بھی ہے، مگر ہمہ وقت ساتھ نہیں دے سکتا۔ پھر بھی جو کچھ یاد آتا گیا اسے فی الوقت رقم کر دیا ہے۔ بقیہ تحقیق قارئین کر دیں گے۔'' (ص ۱۹)

اس کتاب میں زیادہ تر مضامین ان اشخاص سے متعلق ہیں جن سے بلگرامی صاحب متاثر ہوئے، ان میں پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، نواب رحمت اللہ خاں، مسز اندرا گاندھی، الحاج محمد شریف خاں، احسن مارہروی، خواجہ غلام غوث بے خبر خاص ہیں۔ میر بابان علی گڑھ مضمون میں سرسید کو خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ مرتضیٰ حسین بلگرامی کا ماننا ہے کہ سرسید کے علمی جہاد نے قوم کے نوجوانوں کے ذہنوں کو بالیدگی عطا کی، نئی نسل کو ایسے ماحول اور ان کے کاموں سے آگاہ کرنا ہمارا فرض میں قرار پاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس درس گاہ کو اپنی شخصیت سے فیضان پہنچانے اور سید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے جن لوگوں نے خدمت کو ایمان خیال کیا ان کا تعارف کرانا اور ان سے متعارف ہونا بھی ہمارا علمی کارنامہ ہونا چاہیے۔'' (ص ۲۰۲)

اس تعارف کے ذیل میں انھوں نے سید شاہ سلیمان، مولانا سید علی احسن، احسن مارہروی، مولانا ابوبکر شیث اور حسن عبداللہ وغیرہ کی شخصیات کو متعارف کروایا ہے۔

کتاب 'میر و غالب کے حریف' میں شامل ہر مضمون قاری کی توجہ طلب کرتا ہے جو بہت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل بڑا معنی خیز اور پاکیزہ نظر آتا ہے۔

○○

بقیہ: نسل پرستی اور دیگر حیوانی...

صفحہ ۷ سے آگے

لفظوں میں کہا۔

میں نے اس سے متعلق سچ پر بات کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس نے واضح کر دیا کہ چوں کہ اسے دل چسپی نہیں تھی، اس لیے وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ چند دن بعد میری والدہ ناشتے کی میز پر اخبار پڑھ رہی تھیں، 'دی ٹریبون آف جینوا' اور 'لے موند' ان کے سامنے تھے۔ ان دونوں اخباروں میں ایک خبر تفصیل کے ساتھ تھی کہ احمد ایک نجی طیارے میں سفر کرتے وقت فضائی حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ یہ ایک الم ناک خیال تھا اور میں تمنا کر رہی تھی کہ وہ جہاں بھی تھا، وہاں اسے اپنی دل چسپی کا سامان مل گیا ہوگا۔

ایک گھنٹے کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی، میں دروازہ کھولنے گئی تو دیکھا کہ سامنے احمد کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ خوش آئند امید کی روشنی سے منور تھا۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور کچھ دیر بعد اس کا چہرہ لٹک گیا، جیسے ٹوٹ گیا۔

''تم نے سوچا ہوگا کہ میں مر گیا اور اس کے بعد بھی تم رو نہیں رہی ہو۔'' وہ جیسے مجھے روندتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں میری ماں نے بھی اسے اجنبی نظروں سے دیکھا اور بھنچی کی بھنچی رہ گئیں۔ انھوں نے کہا: 'اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحافت کا کردار اب پہلے جیسا نہیں رہ گیا ہے۔ اخباروں میں خبر ہے کہ تم طیارے کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔''

''آپ بھی نہیں رو رہی ہیں۔'' احمد نے کہا۔ شاید وہ اور مجروح ہو گیا تھا۔

''کیا مجھے اس لیے رونا چاہیے کہ تم زندہ ہو؟'' میری ماں نے پوچھا۔ واقعتاً وہ بڑی طرح الجھ کر رہ گئی تھیں۔

دراصل احمد نے یہ خبر خود شائع کرائی تھی، اس امید پر کہ شاید میں اپنی غلطی محسوس کر لوں۔ درحقیقت میں ایک دوست کی موت پر گہرے صدمے سے دوچار تو تھی لیکن اس کی توقع کے برعکس میرا ارادہ قطعی متزلزل نہیں ہوا تھا۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: تحریک۔ تفہیم۔ تدریس

صفحہ ۸ سے آگے

معاشرہ اودھ اور اس کے کمال و زوال کو سمجھنا ضروری ہے اور یہ عناصر انیسویں صدی کی سیاست اور سماج سے گہرا ربط رکھتے ہیں اور بالواسطہ علی گڑھ تحریک سے بھی۔ تحریکات شعر و ادب تخلیقی ذہن اور وژن کو کس کس انداز سے متاثر کرتی ہیں اور تخلیقی ادب میں اس کا اطلاق و انعکاس کس کس زاویے سے ہوتا ہے، ہر چند کہ یہ ایک بے حد نازک اور پیچیدہ عمل ہے تاہم اس نازک امر کو سمجھے بغیر ادب کی مکمل تفہیم ممکن نہیں اور جب جملہ سیاق و سباق کی تفہیم ممکن نہیں تو مناسب و معقول تشریح و تدریس بھی ممکن نہیں۔

اب چند باتیں ترقی پسند تحریک کے بارے میں عرض کروں گا۔

کچھ لوگ ترقی پسند تحریک کو علی گڑھ تحریک کی توسیع کہتے ہیں۔ جو لوگ تاریخی تسلسل اور ارتقا پر یقین رکھتے ہیں وہ لفظ توسیع سے اختلاف تو نہیں کر سکتے لیکن دونوں کے فرق کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کا تعلق اشتراکیت سے نہیں تھا، عورتوں کے مسائل سے بھی کوئی تعلق نہ تھا (اس کے باوجود حالی نے اپنی شاعری اور نذیر احمد نے اپنی ناول نگاری میں عورتوں کو اہمیت دی) جو بعد میں تعلیم و تہذیب کے حوالے سے ترقی پسند تحریک نے پیدا کیے۔ یہ ممکن بھی نہ تھا کیوں کہ دونوں تحریکات کے درمیان زمانی بُعد، جدید علوم و فنون اور عالمی و قومی صورت حال مختلف تھی۔ سرسید نے کچھ انگریزی اور زیادہ انگریزوں سے سیکھا اور تہذیب الاخلاق بھی اسپکٹیٹر (Spectator) کے طرز پر جاری کیا لیکن ان کا نظریہ قوم و ملت تک محدود تھا۔ یہ ان کی نہیں ان کے عہد کی مجبوری تھی۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک کے بانی و سربراہ سجاد ظہیر کے غور و فکر کا سلسلہ قومیت سے شروع ضرور ہوتا ہے لیکن دیکھتے دیکھتے عالمیت تک پھیل جاتا ہے۔ گاندھی سے شروع ہو کر مارکس و لینن تک پہنچتا ہے، جن سے ساری دنیا کے بڑے بڑے ادیب و دانشور متاثر ہو رہے تھے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی، اس کے بعد عالمی شہرت کے ترقی پسند ادیبوں کا جنگ کے خلاف اعلان، ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب، ۱۹۲۳ء میں روماں رولاں نے Declaration of Independence of thought، ۱۹۲۵ء میں Committee of action against War, Danger & Facism قائم ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں اسی کمیٹی کا اجلاس برلن میں ہوا جس میں جواہر لعل نہرو شریک ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں اس کمیٹی کی ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ہنری باربس، روماں رولاں، لوئی آرگوں وغیرہ کی کوششوں سے پیرس میں فاشزم کے خلاف کانفرنس ہوئی جس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند شریک ہوئے۔ غرض کہ یورپ میں طالب علمی کی زندگی گزارتے ہوئے باخبری اور دانشوری کے حوالے سے ان تمام سرگرمیوں اور تبدیلیوں کو ان طالب علموں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا کہ دنیا کے سارے ادیب انسانیت کی بقا، کلچر کے تحفظ اور امن کے قیام کے لیے کوشاں تھے۔ سجاد ظہیر کو احساس ہو گیا کہ افسانوں اور ڈراموں (انگارے) کے ذریعے ایک تخلیق کار کی انفرادی تسلی و تشفی تو ہو سکتی ہے لیکن کوئی بڑا کام نہیں، اسی لیے انھوں نے ساری قوت و صلاحیت تحریک کے قیام پر صرف کی اور ساری زندگی اسی کے لیے وقف کر دی۔ ہندوستان کے حالات بھی کچھ اس طرح کے تھے کہ ترقی پسند تحریک اور آزادی کی تحریک لازم و ملزوم ہو گئے۔ بقول فراق گورکھپوری کہ ترقی پسند تحریک ایک ایسا پودا تھی جو صحیح ماحول اور موسم میں لگایا گیا۔ دیکھتے دیکھتے ترقی پسند تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔ اردو، ہندی زبان و ادب کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس کی رسائی ہوئی۔ سجاد ظہیر، عبدالعلیم، سردار جعفری، احتشام حسین نے بار بار یہ وضاحت کی کہ ترقی پسندی کا تعلق محض اشتراکیت سے نہیں ہے، انسان دوستی اور روشن خیالی سے ہے۔ اس کا اپنی صالح روایت سے بھی گہرا رشتہ ہے۔ سجاد ظہیر نے ذکر حافظ اور سردار جعفری نے 'پیغمبران سخن' جیسی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ درجنوں مضامین میں اس طرح کی مکمل بحثیں کی گئی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سجاد ظہیر اور ان کے رفقا کی پہلی دعوت پر پریم چند، جوش، عبدالحق، اقبال، حسرت موہانی، سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار کھل کر ان نوجوانوں کا ساتھ نہ دیتے اور تحریک بزرگ و خورد کے یادگار فن پارے اور مختلف زبان و ادب کے ناقابل فراموش کارنامے اپنے دامن میں نہ سجا پاتی۔

(بشکریہ انقلاب)

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

پروفیسر عتیق اللہ نے بھوپال میں اس پروگرام کے انعقاد پر مبارک باد دی اور کہا کہ بھوپال سے سردار جعفری کا خاص تعلق رہا ہے۔ لکچر سیشن کے بعد کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت بھوپال کے ممتاز شاعر ظفر صہبائی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض مراد آباد سے تشریف لائے منصور عثمانی نے انجام دیے۔ مشاعرے میں منور رانا، ظفر صہبائی، منصور عثمانی، شکیل اعظمی، اقبال اشہر، حسن کاظمی، مدن موہن دانش، فاروق انجینئر، طارق قمر، ڈاکٹر مہتاب عالم، نصرت مہدی، عذرا نقوی، گوہر رضا اور عادل رشید نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اور سامعین نے بھی سبھی شاعروں کو داد و تحسین سے نوازا۔ اس مشاعرے میں بڑی تعداد میں بھوپال کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۳۰۰/=
دلی کی درگاہ شاہ مرداں	خلیق انجم	۲۰۰/=
پہلا ورق (سہ ماہی اردو ادب کے منتخب اداریے)	اسلم پرویز	
انتخاب و ترتیب: شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی		۳۰۰/=
راس مسعود	حکیم سید ظل الرحمٰن	۲۵۰/=
ناکمل	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں اور دیگر افراد خاندان کے حالات)		
مصنف: سرسید احمد خاں، مرتب: خلیق انجم		۱۵۰/=
ہندوستان میں اردو سیاست کی تفہیم نو	اطہر فاروقی	۲۶۰/=
انقلاب: ایک تاریخ، ایک تہذیب کی کہانی	عابد اللہ غازی	۸۵/=
بلیک ہول (ما بعد جدید آنکھوں کی طویل ڈرامہ)	ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی	۱۲۰/=
دوکان شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ)	عظیم حنفی	۲۰۰/=
دلی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=
غالب تنقید	جاوید رحمانی	۱۱۰/=
سن ستاون کی دلی اور بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	۱۵۰/=
آزاد ہندوستان میں اردو زبان تعلیم اور صحافت	اطہر فاروقی	۱۷۰/=
ہندوستان میں فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۸۰/=
The Court of Indar (اندر سبھا) (سید آغا حسن امانت)	افروز تاج	۳۰۰/=
اردو ہے جس کا نام (رباعیات کا مجموعہ)	امیر چند بہار	۱۱۰/=
پریم چند گھر میں (شیورانی دیوی)	مترجم: سید حسن منظر	۲۰۰/=
ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر (گنجیر پانڈے)	مترجم: سرور الہدیٰ	۲۰۰/=
دلی کے مسلمان دانشور (انیسویں صدی) مصنف: مشیر الحسن	مترجم: مسعود الحق	۲۲۵/=
گفتگو ان کی	اطہر فاروقی	۱۵۰/=
جہان اقبال	عبدالرحیم خاں	۷۵/=
کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (سیاسی اور سماجی پس منظر میں)	ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی	۸۵/=
ہم سفروں کے درمیان	عظیم حنفی	۱۵۰/=
ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری (دیوناگری)	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	۶۰/=
محقق غالب کالی داس گپتا رضا	محمد عارف خاں، ثاقب صدیقی	۸۰/=
ہماری رسمیں	ڈاکٹر نریش	۸۵/=
خواجہ غلام السیدین	پروفیسر آل احمد سرور	۴۲۰/=
خواجہ غلام السیدین (مضامین اور تقریریں)	خلیق انجم	۱۰۰/=
اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۲۵۰/=
دیوان بیان (احسن اللہ خاں بیان)	ارجمند آرا	۱۵۰/=
نوادر اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۳۰/=
بھگود گیتا (اردو منظوم)	شان الحق حقی	۷۰/=
بگولوں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/=
انتخاب جدید (۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۲ء)	آل احمد سرور، عزیز احمد	۱۳۰/=
مصطلحات حقی (علی اکبر الٰہ آبادی)	رشید حسن خاں	۱۲۰/=
انتخاب عزیز لکھنوی	خلیق انجم	۳۰/=
انتخاب فراق گورکھپوری	انجمن ترقی اردو (ہند)	۳۰/=

تحریک۔ تفہیم۔ تدریس

(پہلی قسط)

پروفیسر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ادب کی تاریخ میں رجحانات اور تحریکات کے عمل اور ردعمل کا سلسلہ روز اول سے ہی چلا آرہا ہے۔ یہ تمام رجحانات اور تحریکات اپنے عہد کی معاشرتی زندگی میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں جنھیں ہر دور کا تخلیق کار کچھ شعوری، کچھ لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے، رد بھی کرتا ہے۔ رد و قبول کے یہ سلسلے ہر چند کہ ناقابل فہم ہوتے ہیں، تاہم نقاد، محقق اور مدرس کو انھی اسرار و افکار کو سمجھنا پڑتا ہے اور سمجھانا بھی کہ اس سے نہ صرف عہد و معاشرے سے آگہی ہوتی ہے بلکہ تاریخ و تہذیب، حادثات و تغیرات کا علم و عرفان بھی حاصل ہوتا ہے اور آگے بڑھ کر مستقبل کا انسان سمجھتا اور سنورتا ہے۔

یوں تو ادب کی ہر تخلیق یہاں تک کہ غزل کا ایک شعر یا کبھی کبھی ایک مصرعہ فکر و فلسفہ، اشاریت و بلاغت سے پُر ہوتا ہے، تاہم متن شناسی اور تخلیق فہمی کا سنجیدہ عمل اس کی پرتیں کھولتا ہے، جہاں معانی سے دوچار کرتا ہے، لیکن کسی ایک شعر حتی کہ ایک مکمل افسانہ و ڈراما کی تفہیم و تعلیم مختلف ہے اور اس عہد میں جنم لینے والی تخلیق کا پورے سماجی و تہذیبی پس منظر، رجحان و میلان کو اپنی گرفت میں لینا اور اپنے تنقیدی و تفہیمی شعور کا حصہ ناگزیر بنانا بے حد مختلف اور منفرد ہے۔ یہ عمل اس وقت اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جب رجحان دبستان بن جائے اور نظیر، تحریک۔ کیوں کہ رجحان، دبستان اور تحریک کی حیثیت اور اس حیثیت کی تفہیم و تدریس نہ صرف عمیق بلکہ وسیع تر ہو جاتی ہے اور اس کے بے شمار زاویے، سلسلے، رویے اور نظریے ہوتے ہیں۔ رجحان ایک غیر شعوری رویہ ہوتا ہے جس میں تنظیم یا کسی منصوبے کا دخل نہیں ہوتا۔ وہ ہزار اپنے قاری کو متاثر کرے لیکن عموماً اس کی شناخت انفرادی ہوتی ہے۔ رجحان کی کثرت دبستان کی شکل اختیار کرتی ہے، پھر اسی دبستان کو مزید تقویت و شناخت اس وقت ملتی ہے جب کچھ اصول، قواعد پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اس اصرار، مقدار و معیار کے باوجود ضروری نہیں کہ وہ رجحان یا دبستان تحریک بن جائے جیسے اردو میں دبستان دہلی یا لکھنؤ بنے ضرور لیکن تحریک نہیں بن سکے، اس لیے کہ یہاں اصرار کم انتشار زیادہ تھا، جب کہ تحریک کے لیے باقاعدہ ایک اصول، مقصد، تنظیم وغیرہ ضروری ہوا کرتے ہیں۔ پروفیسر منظر اعظمی اپنی کتاب 'اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ' میں لکھتے ہیں:

"تحریک کے لیے ایک قائد، دستور العمل اور ایک مقصد کی موجودگی ضروری ہے۔ تحریک میں تبلیغ، جدوجہد اور شعوری کوشش کا خاص دخل ہوتا ہے۔ اس کا تعلق کسی مخصوص فکر یا ادبی رویے کے ابلاغ و تشہیر سے ہے۔ تنظیم اگرچہ اس کے لیے ضروری نہیں لیکن ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم، کچھ نیمی اور کچھ نمایاں ہاتھوں کی موجودگی ہر تحریک کے پس پشت نظر آتی ہے۔" (ص ۱۸)

ادبی تحریکات یوں بھی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں اور انھیں ہونا بھی چاہیے، اس لیے کہ شاعروں، فن کاروں کے تصور و تخیل کو اصول و مقصد کا ضرورت سے زیادہ پابند کرنا قطعی مناسب نہیں ہوا کرتا، لیکن یہ بھی ہے کہ اگر زندگی کا کوئی مقصد ہے تو ادب کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، اسی لیے ادبی تحریک سماجی تحریک سے الگ نہیں ہوتیں بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ انھی کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ تخلیق کا شعوری یا لاشعوری طور پر انھی سماجی محرکات سے رشتہ بندھ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی اور غیر شعوری عمل ہے جس کے رد و قبول کے معاملات بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں اور جس پر کوئی حتمی رائے دے پانا مشکل ہوا کرتا ہے۔

اردو زبان و ادب میں بڑی تحریکیں صرف دو ہیں۔ پہلی علی گڑھ تحریک، دوسری ترقی پسند تحریک۔ علی گڑھ تحریک اصلاً سماجی تحریک تھی جس نے شعر و ادب کو متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک خالصتاً ادبی تحریک تھی جس نے ملک و معاشرے کو متاثر کیا۔ دیکھیے یہ کراس (Cross) یہ متضاد و متصادم رویے کہ جب تک ان کو نہ سمجھ لیا جائے تحریک کو ہی نہیں اس عہد کی تخلیق کو بھی سمجھ پانا مشکل ہے۔ کچھ یہ بھی کہ عمر رواں کی پشت پر عمر رواں کا بار ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کا سماج دراصل اٹھارویں صدی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو اسے سترہویں صدی سے بھی جوڑ دیتے ہیں جو شاید غلط نہیں کہ اس صدی کے سیاسی اور سماجی حالات، معاشی تغیرات نے انیسویں صدی کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا تھا کہ جس کی وجہ سے پرانے اور نئے خیالات کے تصادمات محض معنوی اور بے معنی نہیں رہ گئے تھے۔ ممتاز ناقد احتشام حسین نے علی گڑھ تحریک پر ہی مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا:

"یہ ہلچل اور اضطراب، بننے اور بگڑنے کی یہ جدوجہد اور کش مکش نہ بے معنی تھی اور نہ اتفاقی بلکہ اس کے اندر مرنے اور پیدا ہونے کا کرب تھا۔ کسی سانچے میں ڈھل جانے کی بے چینی تھی۔ بگڑنے کا غم اور افسوس اور بنانے کا احساس اور ولولہ تھا اور یہ سب صدیوں کے کچلے ہوئے ارمانوں اور خوابوں، مشرق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔"

(علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو)

اقبال نے بھی کہا تھا:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

تفصیل میں جائے بغیر یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس پامالی اور بدحالی، تبدیلی اور ترقی کو سمجھے بغیر علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد کو نہیں سمجھا جا سکتا اور اگر غرض و مقاصد خارجی طور پر سمجھ میں آ بھی جائیں تو تخلیق کی اس اشاریت کو سمجھ پانا نہایت مشکل ہے جہاں 'توبۃ النصوح' جیسے راست اصلاحی ناول میں مرزا ظاہر دار بیگ جیسا تخلیقی کردار ہے جو کلیم اور نصوح سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ جہاں پرانی تہذیب، شان و شوکت کو بے جا طور پر بچانے اور شیخی بگھارنے، بذلہ سنجی کے عمل میں پوری ایک سماجی حقیقت دخل کر گئی ہے کیا اس حقیقت کو جو اس عہد کی تحریک کا ایک بڑا حصہ تھی، سمجھے بغیر اس ناول اور بالخصوص اس کردار کی تفہیم ہو سکتی ہے۔ 'ایامیٰ'، 'ابن الوقت' جیسے ناول میں بھی بیوہ کی شادی اور کثرت ازدواج وغیرہ کے مسائل کو اہم برہمو سماج، راجہ رام موہن رائے، سر سید غرض کہ علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلوؤں سے الگ کرکے دیکھ سکتے ہیں شاید نہیں۔ حالی، آزاد کی کوششیں، مقدمہ، خطبہ انھیں، اکبر کی بے مثال طنزیہ و مزاحیہ شاعری غرض کہ سب کے سب اس دور کے سماجی و تہذیبی تغیرات سے متاثر ہیں جو علی گڑھ تحریک کے دامن میں جذب و پیوست تھے۔ یہی نہیں اودھ جیسے جاگیرداری معاشرے میں بھی ۱۸۶۰ء میں لکھی گئی مثنوی 'زہر عشق'، 'فسانۂ آزاد' کے خوجی اور 'فردوس بریں' کے حسین کو بھی اس سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ 'زہر عشق' کا عاشق بودا اور نابکھ ہے۔ اسی طرح حسین بھی نابکھ اور جذباتی ہے۔ شدت جذبات میں پہلے دو آنسو بلکہ خون بھی بہاتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس شیخ علی وجودی جو پہلی بار ولین کے مضبوط و مرعوب کردار میں ابھر کر آتا ہے۔ سرشار کا خوجی تو ایک ایسا تاریخی کردار ہے جس کے بارے میں احتشام حسین کا خیال ہے:

"کبھی کبھی تو خوجی پر غور کرتے ہوئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسے صرف لکھنؤ کا انسان سمجھنا اس کی عظمت اور آفاقیت کی توہین ہے۔ وہ ہر ایسے عہد میں پیدا ہوتا ہے جب اس دور کی صداقت پر شک ہونے لگتا ہے۔ وہ ہر وقت عاقلوں کی دنیا پر تنقید کرنے کے لیے آتا ہے اور اپنی احمقانہ باتوں سے بہت سی ایسی صداقتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہے، سنجیدگی جس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔"

(خوجی ایک مطالعہ، ص ۱۸۳)

سچ تو یہ ہے کہ خوجی اودھ کے زوال پذیر معاشرے میں ہی جنم لے سکتا تھا اور حسین بھی معاشرہ اودھ کی پیداوار ہے کہ اس عہد میں مردانہ سماج عیش اور فراریت کا شکار تھا، اس کے بلیغ اشارے مثنوی 'فردوس بریں' اور 'زہر عشق' میں ملتے ہیں۔ ان سب کو سمجھنے کے لیے ادب،

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org